۳۸: روایت ابوداؤد، ترمذی، احمد، اور حاکم۔

۳۹: یہ کلیہ امام شافعی کے الفاظ پر مبنی ہے جو دوسری صدی ہجری کے مشہور اور ممتاز فقیہ تھے۔

۴۰: السرخسی، شرح السیر الکبیر، ۲۹۷۔

۴۱: Oppenheim's International Law, Edited by Lauterpacht, 77

مسلم دنیا میں سماجی و معاشی عدل اور عالمگیریت

محمد عمر چھاپرا

سماجی و معاشی عدل: اسلام میں اس کا مقام

سماجی و معاشی عدل اسلام کی اہم ترین تعلیمات میں سے ایک ہے۔ قرآن کی رو سے، اللہ کے تمام نبیوں کا اولین مقصد دنیا میں عدل قائم کرنا تھا (الحدید ۵۷:۲۵)۔ قرآن کی تمام تعلیمات بنیادی طور پر لوگوں کو اس قابل بنانے کے لیے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکیں اور اپنی باہمی ذمہ داریوں کو دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ پورا کر سکیں تاکہ معاشرے میں عدل اور فلاح کی ضمانت مہیا ہو سکے۔ رسولوں کی آمد کے اس بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن بجا طور پر پیش گوئی کرتا ہے کہ: بے انصافی کا نتیجہ بالآخر تباہی کی شکل میں نکلتا ہے (طٰہٰ ۲۰:۱۱۱)

قرآن، اسلامی تعلیمات کے دو لازمی طور پر قابل اطاعت ماخذوں میں سے ایک ہے۔ سنت نبویؐ دوسرا ماخذ ہے اور وہ بھی عدل و انصاف کی پرزور انداز میں تاکید اور ظلم و بے انصافی کی پوری قوت سے اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ قرآن اگر یہ بتاتا ہے کہ بے انصافی ہلاکت و بربادی پر منتج ہوتی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تاریکی کو اس کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔[۱] بنیادی طور پر دونوں اسی ایک بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے انسانیت کی خیر و فلاح کا عمل اندھیرے اور تباہی سے دو چار ہو جاتا ہے۔

قرآن اور سنت دونوں کی طرف سے، عدل و انصاف پر یہ شدید اور واضح اصرار، مسلمان اہل علم و فکر کی تحریروں میں تاریخ کے تمام ادوار میں منعکس ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ابن تیمیہؒ (م: ۱۳۲۸ء) لکھتے ہیں: ”ظلم کا قطعی طور پر کوئی جواز نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا شکار ہونے والا مسلمان ہے یا

غیر مسلم یا کوئی ظالم شخص۔"[۲] ابن خلدون (م:۱۴۰۶ء) نے بھی پر زور الفاظ میں کہا ہے کہ کسی ملک کے لیے عدل کے بغیر ترقی کرنا ناممکن نہیں۔[۳] اس کی بنیاد پر بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اور ظلم یعنی بے انصافی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ کسی مسلمان معاشرے میں بے انصافی اسی وقت جگہ پا سکتی ہے جب اس کے اندر اسلام کمزور ہو چکا ہو، اسی طرح جب اسلام طاقتور ہوگا تو ظلم کمزور ہوگا۔ مسلم دنیا میں موجودہ دور کی حقیقت یہ ہے کہ بدقسمتی سے اس کے اندر اسلام کمزور ہے لہٰذا ظلم و بے انصافی کا دور دورہ ہے۔

آج کی مسلم دنیا

"مسلم دنیا" کے اس جائزے میں، اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کے تمام ۵۷ ارکان کو شامل رکھا گیا ہے۔ ان ملکوں کی مجموعی آبادی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔[۴] یہ دنیا کی چھ ارب بیس کروڑ کی آبادی کا اکیس فی صد ہے۔ تاہم ایک ارب تیس کروڑ کی اس تعداد میں مسلم ملکوں میں رہنے والے غیر مسلم بھی شامل ہیں، اس لیے ان ملکوں میں مسلمانوں کی اصل آبادی اس سے اس کے بقدر کم ہوگی۔ مگر غیر مسلم ملکوں میں بھی مسلمان آباد ہیں، خصوصا ہندوستان اور چین میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں یورپ، کینڈا، امریکا اور افریقہ میں مسلمانوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔

چنانچہ اگر مسلم ملکوں کی ایک ارب تیس کروڑ کی مجموعی آبادی سے غیر مسلموں کو نکال دیا جائے اور غیر مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کو اس میں شامل کرلیا جائے تو یہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی کل آبادی ہوگی۔ دنیا میں مسلمانوں کی کل آبادی کے بالکل درست اعداد و شمار ہمارے پاس نہیں تاہم مختلف تخمینوں کے مطابق دنیا میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ایک اعشاریہ تین ارب سے لے کر ایک اعشاریہ آٹھ ارب کے درمیان ہے۔

مسلم دنیا میں عدل وانصاف

کسی ملک میں عدل وانصاف کو ظاہر کرنے کے متعدد اشاریے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے

کہ کیا اس ملک میں تمام لوگ بلالحاظ نسل، مذہب، رنگ جنس یا دولت، اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور ان تمام سہولتوں تک رسائی کے قابل ہیں جو زندگی کو آرام دہ بنانے کے لیے درکار ہیں قوت خرید کے موازنے کی بنیاد پر منضبط مجموعی قومی پیداوار (Purchasing Power Parity adjusted GDP) اور لوگوں کے درمیان اس کی تقسیم کے جائزے سے جزوی طور پر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قوت خرید کے موازنے کی بنیاد پر منضبط مجموعی قومی پیداوار کو اس تجزیے کی اساس بنانے کی وجہ یہ ہے کہ عمومی مجموعی قومی پیداوار حقیقی صورت حال کی نشان دہی نہیں کرتی۔ ۵۷ مسلمان ملکوں کی قوت خرید کے موازنے کی بنیاد پر منضبط مجموعی قومی پیداوار صرف ۳ء۹ ٹریلین ڈالر بنتی ہے۔[۵] یہ دنیا کی ۴۸ء۵ ٹریلین ڈالر پر مشتمل قوت خرید کے موازنے کی بنیاد پر منضبط خام قومی پیداوار کا محض آٹھ فی صد ہے۔

اگر یہ مجموعی قومی پیداوار بھی تمام لوگوں کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہوتی تو ہم شکایت نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورت میں ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے تھے کہ مسلم دنیا اگرچہ باقی دنیا کے مقابلے میں غریب ہے مگر یہاں کم سے کم انصاف تو ہے۔ لیکن معاملہ یہ نہیں ہے۔ اصل کیفیت کا پتہ جینی اشاریے (Gini Index) اور آبادی کی بالائی اور نچلی سطح کے دس سے بیس فی صد کی آمدنی اور خرچ کے جائزے سے چل سکتا ہے۔ اس ضمن میں سرسری جائزوں پر مبنی جو اعداد و شمار دستیاب ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آمدنیوں میں زبردست ناہمواریاں ہیں، اس حد تک کہ آبادی کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ بے انتہا پر تعیش زندگی بسر کرتا ہے جبکہ بہت بڑا حصہ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ یہ کیفیت اسلامی تعلیمات کی عکاسی نہیں کرتی۔

مجموعی پی پی پی ایڈجسٹڈ جی ڈی پی اور لوگوں کے درمیان اس کی منصفانہ تقسیم کے علاوہ عدل کا ایک اور اشاریہ سماجی مساوات ہے۔ مسلم معاشرے کی ایک لائق تحسین خصوصیت یہ ہے کہ جب لوگ مساجد میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہاں مکمل مساوات ہوتی ہے اور چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ امیر غریب، گورے کالے، سب اللہ کے سامنے ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے

ہیں۔لیکن دورحاضر کے مسلم ملکوں میں معاشرے کے اندر یہ برابری نظر نہیں آتی۔ پاکستان سمیت پوری دنیا میں سماجی طبقہ بندی بہت بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں رہنے والے لوگ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دنیا کے انتہائی طبقہ بند اور مراتب کے حوالے سے حساس معاشروں میں سے ایک ہے۔

اس بے انصافی اور عدم مساوات کے متعدد سماجی و معاشی، سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں۔ان سب پر گفتگو یہاں ممکن نہیں۔تاہم ان میں سے دو اہم ترین اسباب مناسب تعلیم اور مالی وسائل تک رسائی کا فقدان ہیں۔

تعلیم ان بنیادی عوامل میں سے ایک ہے جو ایک شخص کی آمدنی اور سماجی مرتبے پر اثر انداز ہوتی ہے۔غریبوں کے لیے یہ خاص طور پر اہم ہے کیونکہ وہ سرمایہ کاری سے آمدنی حاصل کرنے کے لیے کوئی اثاثہ نہیں رکھتے۔ان کے پاس ترقی کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔مگر مسلم دنیا میں تعلیمی سہولتیں بھی بڑی حد تک ناپید ہیں۔ناخواندگی کا تناسب ۳۲ فی صد ہے۔اس کا مطلب ہے کہ ۴۲۶ ملین افراد ناخواندہ ہیں۔یہ کیفیت یقینی طور پر بہت تشویش ناک ہے۔

بہرصورت یہ امر ایک حد تک باعث اطمینان ہے کہ اب پرائمری اسکول میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد کا تناسب ۸۹ فی صد ہے۔یہ بات اگرچہ خوش کن ہے مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں آمدنی کے تفاوت میں کسی واضح کمی کا واقع ہونا یقینی نہیں کیونکہ پرائمری اسکول کی تعلیم کسی شخص کے کمانے کی صلاحیت میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں کرتی۔اس لیے سیکنڈری اسکول کی تعلیم بھی ضروری ہے، اگرچہ کافی وہ بھی نہیں۔تاہم سیکنڈری اسکول میں زیر تعلیم طلبہ کا تناسب صرف ۴۴ فی صد ہے۔صرف ایک مغربی ملک امریکہ میں یونیورسٹیوں کی تعداد تمام مسلمان ملکوں کی یونیورسٹیوں کی مجموعی تعداد سے تین گنا ہے۔شنگھائی ژیاؤ تانگ یونیورسٹی کے ایک جائزے کے مطابق مسلم اکثریت والے ملکوں کی ایک یونیورسٹی بھی، دنیا کی چوٹی کی ۵۰۰ یونیورسٹیوں میں شامل نہیں۔[۶] ایک اور تشویش ناک حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ۷۴ فی صد آبادی کو صاف پانی میسر ہے لیکن حفظان صحت اور صفائی کی سہولتیں صرف ۶۲ فی

صد کو میسر ہیں۔ ۷ غریبوں کی بستیوں اور دیہی علاقوں میں دستیاب طبی سہولتیں انتہائی ناکافی ہیں۔ یہ تمام نقائص اور کوتاہیاں غریبوں کے لیے سنگین ناسازگاریوں کا سبب ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بنیادی ضروریات تک کی تکمیل سے قاصر ہیں بلکہ اپنے اور اپنے بچوں کے حالات کو بہتر بنانے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ یہ کیفیت ان کے لیے مستقبل میں بہتری کے امکانات پر بھی منفی اثرات ڈال رہی ہے۔

صورت حال کو بہتر بنانے میں جو عامل رکاوٹ بن رہا ہے وہ یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں، جن میں بیشتر غریب طلبہ جاتے ہیں، تعلیم کا معیار بہت پست ہے۔ پرائیویٹ اسکول، جو بہتر تعلیم دیتے ہیں، اتنے مہنگے ہو گئے ہیں کہ غریبوں کی دسترس سے قطعی باہر ہیں۔ چونکہ عموماً اعلیٰ تعلیم ہی ہے جو ذہین طلبہ کو ترقی کرنے کے لائق بناتی ہے، لہٰذا غریب والدین کے بچے اپنے حالات کو بہتر بنانے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اور اگر مسلم دنیا میں اقربا پروری اور منظور نظر افراد کو نوازنے کا موجودہ رجحان کسی روک ٹوک کے بغیر جاری رہا تو یہ مشکل مزید بڑھ سکتی۔

دوسرا بڑا عامل جو غریبوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہے، وہ ان کی جانب سے چھوٹے کاروبار شروع کیے جانے کے لیے سرمایے کی عدم دستیابی ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ رقوم جمع کرانے والے افراد کے وسیع سلسلے کے فراہم کردہ وسائل کو قرض حاصل کرنے والے افراد کے اسی درجہ وسیع سلسلے تک پھیلایا جائے۔ تاہم دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں کیفیت اس کے برعکس ہے۔ مثلاً پاکستان میں تجارتی بینکوں کو، دس ملین روپے سے کم رقم جمع کرانے والے افراد کی طرف سے ۲۰۰۶ء میں مالیاتی وسائل کا ۸۸ء۶۴ فی صد فراہم کیا گیا۔ رقوم جمع کرانے والے ان افراد کی تعداد ۲۶ء۵۷ ملین تھی اور یہ تعداد رقم جمع کرانے والے کل افراد کا ۹۹ء۹۳ فی صد بنتی ہے۔ لیکن بینکوں کی طرف سے ان لوگوں کے فراہم کردہ مالیاتی وسائل کا صرف ایک تہائی ان افراد کو دیا گیا جو دس ملین سے کم کا قرضہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قرض لینے والوں کی مجموعی تعداد کے ۹۷ء۱۲ فی صد پر مشتمل وہ لوگ جو ایک ملین سے کم کے قرضوں کے خواہاں تھے، ان کا حصہ اس سے بھی کم رہا یعنی قرضوں کی کل مالیت کا محض ۲۰ء۸۵ فی صد۔ اس کے مقابلے میں دس ملین سے زیادہ رقوم جمع کرانے والے افراد جو رقوم جمع کرانے والے کل

افراد کے محض ۰۷ء۰ فی صد پر مشتمل تھے، انہوں نے کل جمع شدہ رقم کا صرف ایک تہائی فراہم کیا، لیکن جو قرضے انہوں نے حاصل کیے وہ فراہم کردہ قرضوں کی کل مالیت کا دو تہائی تھے (جدول دیکھیے)۔ اس تفصیل سے واضح ہے کہ قرض لینے والوں میں سے ایک فی صد سے بھی کم کا تناسب رکھنے والے تقریباً دو تہائی قرضے حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس کیفیت سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ رجحان برقرار رہا تو مستقبل میں بھی آمدنی اور دولت کی ناہمواریاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی رہیں گی۔

تجارتی بنکوں میں رقوم کی تقسیم

جمع شدہ اور قرض پر دی گئی رقوم بہ لحاظ مالیت

	کھاتوں کی تعداد	کُل کا فی صد	رقم (ملین روپے)	کُل کا فی صد
جمع شدہ رقوم کی تقسیم				
ایک لاکھ روپے سے کم	22,452,043	84.42	514,499.0	17.58
ایک لاکھ تا دس لاکھ روپے	3,911,157	14.70	888,872.3	30.38
دس لاکھ تا ایک کروڑ روپے	213,249	0.81	494968.2	16.92
ایک کروڑ روپے سے زائد	19,136	0.07	1,028,273.5	35.13
کُل	26,595,585	100	2,926,644.7	100
قرض پر دی گئی رقوم کی تقسیم				
ایک لاکھ روپے سے کم	3,540,533	71.68	164,384.3	7.15
ایک لاکھ تا دس لاکھ روپے	1,256,971	25.44	315,245.6	13.70
دس لاکھ تا ایک کروڑ روپے	118,668	2.40	333,554.7	14.50
ایک کروڑ روپے سے زائد	22,645	0.48	1,487,348.6	64.65
کُل	4,938,817	100	2,300,533.3	100

ماخذ: شماریاتی بلیٹن ۲۰۰۶ء اسٹیٹ بنک آف پاکستان سے ماخوذ

سماجی و معاشی عدل کا ایک اور پیمانہ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کا تیار کردہ انسانی ترقی کا اشاریہ (ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس: HDI) ہے۔ یہ کوئی جامع اشاریہ نہیں کیونکہ یہ ترقیاتی معاشیات کے ماضی کے محدود نقشہ کار پر مبنی ہے۔ جب محض چند معاشی متغیرات کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اس میں صرف تین نکات یعنی پیدائش کے وقت زندگی کے امکانات، خواندگی اور قوت خرید کے موازنے کی بنیاد پر منضبط فی کس خالص قومی پیداوار شامل ہیں۔ اس محدود اشاریے کے باوجود صرف دس مسلم ملک اس حوالے سے اعلیٰ سطح کے نمبر حاصل کر سکے ہیں۔ اس میں ملائشیا اور البانیہ کے سوا تیل پیدا کرنے والے ممالک شامل ہیں۔ ۲۸ ملکوں نے اوسط درجے کے نمبر حاصل کیے جبکہ ۱۲ ملک پست سطح پر رہے۔ ۸

زیادہ جامع اور مکمل اشاریے میں عدل، خاندانی یکجہتی، سماجی ہم آہنگی، آمدنی اور دولت کی منصفانہ تقسیم، اور ذہنی سکون شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے انسانی ترقی کے اشاریے کے تین نکات کے علاوہ انسانی ترقی کی یہ چند مزید بنیادی ضروریات ہیں۔ اگر اس اشاریے میں اہلیت اور محنت کے لیے انعام، جرائم، کشیدگی اور بے قاعدگیوں میں کمی، جمہوریت، آزادی اظہار، اور آزاد و دیانت دار عدلیہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اور اچھا ہو۔ اگرچہ ان تمام متغیرات کے لیے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں، اس کے باوجود یہ اہم ہیں، اور ان کے اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش بہت نتیجہ خیز ہوگی۔ اشاریے میں یہ سارے متغیرات شامل کر لیے جائیں اور اس کے بعد مسلم ممالک اعلیٰ درجے کے نمبر حاصل نہ کر سکیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہوگی، اس کے باوجود ان میں سے بعض حوالوں سے ان کی کارکردگی بہتر ہو سکتی ہے، مثلاً مسلم دنیا میں خاندانی یکجہتی، یورپ اور امریکا کے مقابلے میں، اب بھی بلند سطح پر ہے۔

مسلم دنیا میں اسلام کا احیاء امید پیدا کرتا ہے کہ صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں رونما ہونے والی موجودہ افسوسناک کیفیت کے مقابلے میں جس کی نشاندہی اس جامع اشاریے سے ہوتی ہے، حالات بتدریج بہتر ہوں گے۔ تاہم اگر ہمارے تعلیمی نظام کی اصلاح نہ ہوئی تو یہ امید دن کی روشنی

نہیں دیکھ سکے گی۔ بدقسمتی سے، اُس قسم کے کردار پر زیادہ توجہ دینے کے بجائے جو اسلام مسلمانوں کے اندر پروان چڑھانا چاہتا ہے، بعض مسلمان ملکوں میں تعلیمی نظام کو اسی طرح سیکولر بنانے کی تحریک جاری ہے جس طرح مغرب میں ہوا ہے۔ خبری ذرائع ابلاغ اور فلمی صنعت بھی تخریب اخلاق کی مغربی روش پر گامزن ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا میں مغرب کی طرح خاندان کے منتشر ہونے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ طلاق کی شرح بتدریج بڑھ رہی ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہ میں سے ایک بڑھتا ہوا صنفی اختلاط اور عورتوں کا اسلام کے عطا کردہ حقوق سے محروم رکھا جانا ہے۔ جب عورتیں تعلیم یافتہ اور خود مختار نہیں تھیں تو ان کے پاس شوہر اور سسرال والوں کی بدسلوکی کو برداشت کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تاہم اب جبکہ وہ تعلیم یافتہ اور خود مختار ہوتی جا رہی ہیں تو اب اگر اس کے ساتھ صنفی اختلاط میں اضافے اور عورتوں کو اسلام کے دیے ہوئے حقوق سے محروم رکھنے کا سلسلہ جاری رہا تو نتیجتاً مسلم دنیا میں طلاقوں کی شرح بڑھتی چلی جائے گی۔

معاشرے کے عروج و زوال کے اسباب

یہ گفتگو ہمیں اس اہم سوال تک لے آئی ہے کہ مسلمان پہلے ترقی کے انتہائی بلند مدارج تک کس طرح پہنچے اور پھر زوال پذیر ہونا کیوں شروع ہو گئے یہاں تک کہ موجودہ پست سطح تک نیچے گر گئے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ متعدد اخلاقی، نفسیاتی، سماجی، معاشی، سیاسی، نسلی اور تاریخی عوامل اس کیفیت کے ذمہ دار ہیں۔ ترقیاتی معاشیات، ابھی حالیہ دور تک، صرف معاشی عامل کو ملحوظ رکھا کرتی تھی اور باقی تمام عوامل کو خارجی بلکہ شاید غیر متعلق قرار دیتی تھی۔ تاہم ماضی میں ابن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۶ء) اور گبن (۱۷۳۷ء-۱۷۹۴ء) اور اس کے بعد حالیہ دور تک سپنگلر، ٹوائن بی، شوئٹزر، سوروکن، نارتھ، تھامس اور کینیڈی سمیت متعدد مفکرین نے اس طرز فکر کی تقلید نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے ان تمام عوامل کو ملحوظ رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فلاح یا مصائب کا تعین صرف معاشیات سے نہیں ہوتا بلکہ غیر معاشی اسباب و عوامل بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی

سبب نہیں کہ ہم ان عوامل کو نظر انداز کردیں اور اپنے تجزیے میں صرف معاشی اسباب کو ملحوظ رکھیں۔

ان تمام مفکرین میں سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا، یہ مقالہ بنیادی طور پر ان خلدون کے تجزیے پر منحصر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کام اصلاً مسلم تہذیب سے متعلق ہے، جس کے انحطاط کا سلسلہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ عباسی خلافت ان کی پیدائش سے تقریباً پون صدی پہلے، منگولوں کے تباہ کن حملوں اور ان کے ہاتھوں بغداد اور اس کے مضافات کی بربادی کے نتیجے میں ختم ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں کاکیشیا کے سرکیسیائی مملوک (۱۳۸۲ء-۱۵۱۷ء)، جن کے عہد اقتدار میں ابن خلدون نے اپنی عمر کا تقریباً ایک تہائی حصہ بسر کیا، بدعنوان اور نااہل تھے۔ انہوں نے جو پالیسیاں اپنائیں ان سے انحطاط کی رفتار میں اضافے کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ایک حساس و دردمند مسلمان کی حیثیت سے وہ زوال وانحطاط کے اس عمل کو فروغ وترقی سے بدلنا چاہتے تھے۔

ایک سماجی سائنسدان ہونے کی بناء پر وہ بخوبی جانتے تھے کہ ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس امر کا تجزیہ نہ کیا جائے کہ وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو عروج بخشا اور پھر کون سے اسباب ان کے انحطاط کی وجہ بنے۔ اس بناء پر وہ صرف اس میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے کہ کیا ہوا، بلکہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ معاملات نے یہ رنگ کیوں اختیار کیا۔ وہ مختلف تاریخی واقعات کے درمیان سبب اور نتیجے کا رشتہ دریافت کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنے معاشرے کے امراض کا علاج تجویز کرنے کے لائق ہوسکیں۔ 'مقدمہ ابن خلدون' اسی خواہش کا مظہر ہے۔ اس میں وہ ان اسباب وعوامل کا سائنٹفک طور پر تجزیہ کرتے ہیں جو بادشاہتوں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کے ذمہ دار ہیں۔ اس بات کا سہرا ان کے سر ہے کہ محض ایک متغیرے (variable) پر انحصار کرنے کے بجائے وہ اخلاقی، نفسیاتی، سیاسی، سماجی، نسلی اور تاریخی سمیت متعدد متغیرات کو اپنے تجزیے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔

ابن خلدون کا ماڈل

ابن خلدون کے تجزیے کی طاقت اس کے کثیر الضوابط اور متحرک کردار میں پوشیدہ ہے۔ یہ کثیر الضوابط ہے کیونکہ تمام اہم سماجی ومعاشی اور سیاسی متغیروں کو ایک دائرہ میں اور باہم متعلق طریقے سے

مربوط کرتا ہے، جس میں ہر ایک دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے اور جواباً دوسروں سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ یہ متغیرے حسب ذیل ہیں:

۱-ایک خودمختار یا سیاسی مقتدرہ

۲-طرزعمل کے عقائد وقوانین یا شریعت

۳-عوام

۴-دولت یا وسائل کا ذخیرہ

۵-ترقیاتی عمل

۶-عدل۹

ان کے ماڈل میں اس دائرے کا آپریشن چونکہ تین نسلوں یعنی تقریباً ۱۲۰ سال کی مدت میں زنجیری عمل کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے، اس لیے تجزیے میں تحرک کی ایک سمت خود بخود متعارف ہو جاتی ہے، اور اس امر کی وضاحت میں مدد کرتی ہے کہ سیاسی، اخلاقی، اداراتی، سماجی، نسلی، اور تاریخی عوامل کس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی سلطنت یا تہذیب کو ارتقاء وانحطاط یا عروج وزوال کی جانب لے جانے میں ایک دوسرے کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ متغیروں میں سے ایک بندوق کے ٹریگر کے میکانکی نظام کی طرح کام کرتا ہے۔۱۰ اگر دوسرے شعبے اسی سمت میں ردعمل ظاہر کریں جو ٹریگر کے نظام کی سمت ہے تو انحطاط باہم مربوط زنجیری عمل کے ذریعے اتنا تیز رفتار ہو جائے گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نتائج و اثرات سے اصل وجہ کو ممیّز کرنا مشکل ہوتا جائے گا۔ تاہم اگر دوسرے شعبے اسی سمت میں ردعمل ظاہر نہ کریں تو ایک شعبے میں رونما ہونے والا انحطاط دوسرے شعبوں تک نہیں پھیلتا اور یا تو زوال کا شکار ہونے والا شعبہ وقت کے ساتھ ساتھ اصلاح پذیر ہو جاتا ہے یا تہذیب کے زوال کی رفتار بہت دھیمی ہو جاتی ہے۔

یہ ماڈل جس چیز پر دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ کسی سلطنت یا تہذیب کا عروج وزوال متعدد عوامل پر منحصر ہے مگر ان میں سے اہم ترین، خود انسان ہے جو ترقی کا مقصد بھی ہے اور ذریعہ بھی۔

دوسرے تمام عوامل اس کے رویے اور فلاح و بہبود پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے اہم ہیں۔ ان دوسرے عوامل میں سے دو اہم ترین عوامل ترقی اور عدل ہیں۔ انسان اس وقت تک پوری دلچسپی اور توجہ سے کام نہیں کرے گا اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو استعمال میں نہیں لائے گا جب تک اس کی بہبود اور بہتری یقینی نہ بنائی جائے۔ اس کے لیے مالی وسائل اور ترقی درکار ہے۔ لیکن ترقی کا عمل اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہو سکتا جب تک عدل و انصاف کا اہتمام نہ ہو۔ عدل کا تقاضا ہے کہ معاملات کے لیے کچھ اصول یا اخلاقی اقدار ہوں۔ یہ چیزیں شریعت کی جانب سے فراہم کی گئی ہیں۔

تاہم معاملات کے یہ اصول اس وقت تک مؤثر نہیں ہوں گے جب تک انہیں نافذ نہ کیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آخرت کی جواب دہی کا تصور، جو اسلامی شریعت اور دیگر مذاہب مہیا کرتے ہیں، اہم ہو جاتا ہے۔ چونکہ تمام لوگ لازمی طور پر اخلاقی اقدار کے احکام کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے، اس لیے منفی رویوں کو روکنے اور عدل کو یقینی بنانے میں حکومت کا کردار اہم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عوام، دولت، ترقی، عدل، شریعت اور حکومت سب کے کردار اس ماڈل میں باہم مربوط ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشی عدل، ابن خلدون کے ماڈل کی رو سے، معاشرے کے عروج و زوال میں انتہائی اہم مقام رکھتا ہے۔

مسلمانوں کے عروج کا سبب بننے والے عوامل

آیئے اب ہم ان عوامل کا جائزہ لیں جو مسلمان معاشروں کے عروج و ترقی کا سبب بنے۔ ٹوائن بی (۱۹۵۷ء)، ہٹی (۱۹۵۷ء)، ہوڈگسن (۱۹۷۷ء)، بائیک (۱۹۹۴ء)، اور لیوس (۱۹۹۵ء) سمیت متعدد مفکروں کا کہنا ہے کہ مسلم معاشروں کی ترقی اور عروج میں اسلام نے ٹریگر میکانزم کا کام کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی اس سوال کا جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہے کہ ایک بدوی معاشرہ تمام رکاوٹوں کے باوجود، پسماندگی کی انتہائی پستیوں سے اٹھ کر، اس تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے کے قابل کس طرح ہو گیا۔ اس دور میں اس بدوی معاشرے کی اولین خصوصیات میں شدید باہمی دشمنیاں، وسائل کی قلت، سخت آب و ہوا، اور سنگلاخ زمین شامل تھی۔ اس کے پاس اپنی پڑوسی

ساسانی اور بازنطینی سلطنتوں کی طرح کوئی مادّی اثاثے نہیں تھے۔ اپنی طویل اور تباہ کن باہمی لڑائیوں کے نتیجے میں یہ بادشاہتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک اپنی طاقت اگرچہ بڑی حد تک کھو چکی تھیں اس کے باوجود علمی، معاشی اور فوجی اعتبار سے وہ دیارِ عرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ: اسلام نے اس بدوی معاشرے کو اس طور پر تبدیل کرنے کا کام کیسے کیا جس سے اس نے نہ صرف اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پایا بلکہ ان معاشروں میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دیں جو اس کے زیر اثر آئے؟ اسلام کے بغیر، ٹوائن بی کے الفاظ میں، ''وہ مخفی روحانی قوتیں اس قدر غیر معمولی انداز میں بروئے کار نہیں آسکتی تھیں جن کے ذریعے اسلام نے اپنے آپ کو انتہائی متاثر کن شکل دی اور چھ صدیوں کی مدت میں اپنے مشن کو مکمل کر دکھایا۔''[11]

اسلام نے بنیادی طور پر ترقی کے تمام عوامل کو مثبت سمت میں متحرک کیا۔ اس نے انسانی وسائل پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی، جو کسی بھی معاشرے کے عروج یا زوال کے پیچھے کارفرما اصل قوت ہوتے ہیں۔ اس نے لوگوں کو بہتر انسان بنانے کے لیے بیک وقت اخلاقی طور پر بھی بلند کیا اور مادّی طور پر بھی، اور ان تمام اداروں کی اصلاح کی جو لوگوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اسلام کے انقلابی عالمی تصور نے زندگی کے بارے میں لوگوں کے نقطہ نظر کو تبدیل کر کے بامعنی اور بامقصد بنا دیا۔ اس نے انہیں عدل و انصاف، وقار، برابری، عزت نفس، اور زندہ رہنے کے لیے ایک اعلیٰ مشن عطا کیا۔ اس نے ہر شخص کو عزت و ناموس اور زندگی و جائیداد کا تحفظ فراہم کیا۔ اس نے اخلاقیات اور مادّی وسائل دونوں کو انسانی ترقی اور فلاح کے لیے اساسی اہمیت دی اور ان کے درمیان توازن قائم کیا۔

اسلام نے اس طرح کسان، دست کار اور تاجر کو اس دور کے مزدکی مسیحی معاشرے میں اُسے حاصل مقام کی نسبت بلند تر اور زیادہ باعزت مرتبہ عطا کیا۔ اس نے قبیلے کے بجائے ان کی وفاداری کا رشتہ خدا سے استوار کر کے فرد کے ذہنی افق کو یکساں عقیدہ رکھنے والی امت، اور خدا کے ایک ہی کنبے کے ارکان کی حیثیت سے پوری انسانیت تک وسیع کر دیا۔ یوں ترقی کے لیے نوبل انعام یافتہ پروفیسر

ڈگلس نارتھ کی بتائی ہوئی اداراتی ضرورت کی تکمیل ہوگئی۔[12] لہٰذا شیٹز ملر کا یہ کہنا درست ہے کہ ''وہ تمام عوامل جنھوں نے یورپ کو آگے بڑھنے کے قابل بنایا، اسلام کو اس سے کہیں پہلے سے حاصل تھے۔[13]

سب سے اہم اور لاجواب چیز جسے اسلام نے روحانیت پر مبنی اپنے عالمگیر تصورِ حیات کے ذریعے عملی حقیقت بنایا، سماجی و معاشی عدل کا نفاذ ہے، کوہن نے اس امر کا بجا طور پر اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے ''قرآنی قانون سازی میں غیر مراعات یافتہ طبقوں کی تائید وحمایت کا رجحان کارفرما تھا۔''[14] کمزور اور پس ماندہ طبقات کے مرتبے اور بہبود میں وہ انقلابی بہتری رونما ہوئی جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ اس کے نتیجے میں ایسی سماجی یکجہتی پیدا ہوئی جس نے مسلمانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا (القرآن، الصّف ۶۱:۴)۔ یہ ایسی چیز تھی جسے اس مقصد کے لیے دولت کے انبار خرچ کر کے بھی حاصل کرنا محال تھا۔ (القرآن، الانفال ۸:۶۳)۔ یہ سب کچھ اخلاقی اور اداراتی اصلاح کے ذریعے ہوا جس نے فرد کو معاشرے کے دوسرے افراد کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس عطا کیا۔ حکومت نے بھی اس کام میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس نے قانون اور نظم وضبط نیز عدل و انصاف کی بالادستی کو یقینی بنانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتی تھی۔ اس نے ایک عدالتی نظام قائم کیا جس میں قانون بڑے اور چھوٹے اور پست و بلند سب پر یکساں طور پر نافذ ہوتا تھا۔ اس لیے اس کردار کو ضرورت سے زیادہ نمایاں کرنا ممکن نہیں جو مسلمانوں کے عروج وترقی میں سماجی و معاشی عدل نے ادا کیا۔

مسلمانوں کے زوال کا سبب بننے والے عوامل

ان رفیع الشان بلندیوں پر پہنچنے کے بعد وہ کیا چیز تھی جو مسلمانوں کے انحطاط کے آغاز کا باعث بنی؟ ابن خلدون کے بقول، اس معاملے میں ٹریگر میکانزم کا کام سیاسی لاقانونیت نے انجام دیا جس کی ابتداء ۶۷۶/۷۷ میں خلیفۃ المسلمین حضرت معاویہؓ کی جانب سے خلافت کے منصب کے لیے اپنے بیٹے یزید کی نامزدگی سے ہوئی۔ یہ اقدام، کاروبارِ ریاست کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کی

کھلی خلاف ورزی تھا۔ تاہم خلافت کے خاتمے کے فوراً بعد ہی سیاسی مقتدرہ، استبدادی حکومت کی سی پستی میں نہیں جا گری۔ سماجی و معاشی عدل کو یقینی بنانے کے دباؤ کے تحت عوام اور حکومت دونوں کے لیے شریعت کے ذریعۂ ہدایت ہونے کا تسلسل برقرار رہا۔ بد قسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومتیں زیادہ مطلق العنان اور استبدادی ہوتی چلی گئیں۔ شریعت کے بالکل برخلاف حکمرانوں اور سیاسی اشرافیہ کی جوابدہی، قانون کی نگاہ میں برابری اور آزادی اظہار کی اقدار میں انحطاط رونما ہونے لگا۔ عدل اور ترقی اس کا بدترین ہدف بنے۔ عوام مشکلات میں مبتلا ہوئے، جس سے ان کے کام کرنے کا جذبہ، پیداواری صلاحیت اور اختراعی اہلیت متاثر ہوئی۔ سیاسی لاقانونیت کے وائرس نے ایک چکر کی صورت میں بتدریج معاشرے کے دوسرے تمام شعبوں اور معیشت کو جراثیم زدہ کر دیا۔ ان سب میں سماجی و معاشی عدل اور ترقی پر سب سے زیادہ منفی اثرات پڑے۔ نتیجتاً مسلم دنیا ترقی کے اس تحرک سے محروم ہوتی چلی گئی جس کا آغاز اسلام نے کیا تھا، اور انحطاط اس حد تک جا پہنچا کہ وہ یورپی طاقتوں کے تسلط سے اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔

انسانی عوامل کا کردار

مسلمانوں کے زوال میں اگرچہ خلافت کے خاتمے اور اس کی جگہ استبدادی حکومتوں کے قیام نے ٹریگر میکانزم کا کام کیا، تاہم مقدمہ ابن خلدون تجزیے کا محور انسانی عوامل کو بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے، جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا، کہ انسان ترقی کی غایت بھی ہے اور ذریعہ بھی۔ اگر وہ ٹھیک ہو تو تمام سماجی و معاشی اور سیاسی ادارے درست طور پر کام کرتے ہیں۔ اور اگر وہ ٹھیک نہ ہو تو کوئی بھی چیز صحیح طریقے سے کام نہیں کر سکتی۔ اس لیے معاشروں کا عروج و زوال، بڑی حد تک انسان کی اپنی بہتری اور ابتری پر منحصر ہے۔ یہ بات قرآن کی اس تعلیم کے عین مطابق ہے کہ ''ان اللہ لا یغیر مابقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم ''یعنی اللہ لوگوں کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں (الرعد ۱۳:۱۱)۔

یہ نکتہ ہمیں انسان کی اصلاح کی جانب لے جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کیا جانا

چاہیے؟ یہاں خاندان، معاشرے، معیشت اور سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے میں عدل و انصاف بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہر انسان کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی جائیں جو اس کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے درکار ہوں تاکہ وہ ان سے اپنے آپ کو اور اپنے معاشرے کو بہتر سے بہتر طور پر مستفید کرنے کے لائق ہو سکے۔ اس کی اصلاح کے لیے درکار ضرورتوں میں موزوں اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی ماحول میں مناسب پرورش، تربیت اور تعلیم انتہائی ناگزیر ہیں اور اس کے ساتھ سماجی و معاشی انصاف کو یقینی بنانے کے لیے مؤثر طور پر نافذ العمل ترغیبات اور موانع کا اہتمام لازمی ہے۔

موجودہ دور میں اصلاح کے لیے درکار یہ لوازم مسلم دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہاں ۴۲۶ ملین ناخواندہ افراد ہیں۔ انہیں تعلیم سے اس حد تک محروم رکھا گیا ہے کہ وہ معمولی لکھت پڑھت سے بھی ناواقف ہیں، ان کے ساتھ شدید ظلم اور ناانصافی کی گئی ہے۔ تاہم محض پڑھ لکھ لینے کی صلاحیت ایک شخص کو اس لائق بنانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی بہتری اور اپنے خاندان اور معاشرے کی ترقی کے لیے بخوبی اپنا کردار انجام دے سکے۔ اس کے لیے اسے مناسب اخلاقی اور تکنیکی تعلیم دینا بھی ضروری ہے تاکہ وہ نہ صرف یہ کہ اچھا مسلمان بنے بلکہ خود اپنی ضروریات اور دوسروں کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کے لے ضروری حد تک کمانے کے قابل بھی ہو سکے۔

اس سے بھی زیادہ خراب کیفیت مسلمان عورتوں کی ہے جو اسلام کے عطا کردہ حقوق سے محروم کر رکھی گئی ہیں۔ اسلام کے مثالی ادوار میں، مسلمان خواتین کو بھی معاشرے کے رکن کی حیثیت سے تعلیمی سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں تاکہ وہ باعزت مقام حاصل کر سکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات زندگی کے بارے میں مرتب کیے گئے تحریری ذخیرے میں صحابیات کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی کی اسکالر رتھ روڈڈ کے مطابق، حالات زندگی سے متعلق اس تحریری ذخیرے میں صحابیات کا حصہ دس سے پندرہ فی صد ہے۔[۱۵] حالات زندگی سے متعلق نویں صدی سے

تحریر کیے گئے چالیس مجموعوں میں موجود ہزاروں مسلم خواتین کے سوانحی تذکرے پڑھنے کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انہیں نہ تو معاشرے سے کاٹ کر رکھا گیا تھا نہ کنارے لگایا گیا تھا۔عثمانی دور کے حلب شہر کے اوقاف کا مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ۴۱ فی صد اوقاف خواتین کے قائم کردہ تھے اور خواتین کے یہ اوقاف، مردوں کے قائم کردہ اوقاف سے کسی طرح کم نہ تھے۔[۱۶]

ان تعلیمی و تحقیقی سہولتوں کی بناء پر جو ماضی کے اسلامی ادوار میں دستیاب تھیں، مسلمان پوری دنیا کے لیے ٹھوس اور نمایاں علمی خدمات انجام دینے کے قابل تھے۔ جارج سارٹن اپنی کتاب *انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس* میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے ریاضی، سائنس، طب، فلسفے اور ادب میں چار سو سال، آٹھویں صدی کے وسط سے بارھویں صدی کے وسط تک، انقلابی کارنامے انجام دیے۔ اس بناء پر انہوں نے ان میدانوں میں بالادست حیثیت حاصل کی۔ بلند ترین مقام سے محروم ہونے کے بعد بھی انہوں نے مزید دو سو سال، بارھویں صدی کے وسط سے چودھویں صدی کے وسط تک، اہم کارنامے انجام دیے۔[۱۷] اس کے بعد ہم مشکل ہی سے بڑے کارنامے انجام دینے والے سائنسدانوں کی فہرست میں کسی مسلمان کا نام دیکھتے ہیں۔

عدل: پاکستان اور مسلم دنیا میں

بڑی عجیب بات ہے کہ اسلام میں عدل کو بہت زیادہ اہمیت دیے جانے کے باوجود، پاکستان کی ترقیاتی پالیسی میں عدل کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہمارے ہاں ڈاکٹر محبوب الحق جیسے بڑے ماہر معاشیات تک کا، جو پاکستان میں وزیر منصوبہ بندی بھی رہے، خیال تھا کہ عدل و انصاف تعیش ہے اور پاکستان اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان کا یہ نقطہ نظر اس دور کے ترقیاتی معاشیات سے ہم آہنگ تھا۔ اس فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''کم ترقی یافتہ ملکوں کو لازماً شعوری طور پر بڑھوتری کے فلسفے کو قبول کرنا چاہیے اور منصفانہ تقسیم اور فلاحی ریاست کے تمام مثالی معیارات کو مستقبل بعید کے لیے بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ یہ تعیّشات ہیں اور صرف ترقی یافتہ ملک ہی ان کے متحمل ہوسکتے ہیں۔[۱۸]

یہ وہ فلسفہ ہے جس نے پاکستان میں ترقیاتی پالیسیوں کی سمت متعین کی اور ہمارے معاشرے میں مستقبل کے مصائب کے بیج بوئے۔ جب تک محنت کش اور عام لوگ اپنی محنت اور پیداواری کاوشوں کا جائز صلہ نہ پائیں، اس وقت تک وہ اپنی حقیقی صلاحیت کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ انصاف کے بغیر اسلام کو مطلوب انسانی اخوت محض ایک کھوکھلا نعرہ رہے گی۔ لہٰذا ایک ایسے معاشرے کا قیام ضروری ہے جس میں سماجی و معاشی عدل ہو، تاکہ نہ صرف یہ کہ لوگ اپنی محنت کا جائز صلہ پانے کے قابل ہوسکیں، بلکہ اپنے دوسرے تمام حقوق بھی حاصل کرسکیں۔

عدل کو پروان چڑھانے کے لیے ایسے نظام کی موجودگی ضروری ہے جو غریبوں اور حاجت مندوں کی مناسب دیکھ بھال کی ضمانت بھی مہیا کرتا ہو۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے ایک بہت مؤثر ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ زکوٰۃ کا ادارہ ہے۔ ابتداء میں حکومتیں یہ بات نہیں سمجھتی تھیں کہ زکوٰۃ کا کردار سماجی و معاشی عدل اور ترقی کے عمل کو فروغ دے سکتا ہے۔ اور یہ کہ زکوٰۃ کو غریبوں اور معذوروں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس سے انہیں تعلیم بھی فراہم کی جاسکتی ہے، اور چھوٹے کاروباروں کے لیے سرمایہ بھی مہیا کیا جاسکتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔ صدر ضیاء الحق نے اس ادارے کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم اس نے ابھی تک وہ اہم کردار ادا کرنا شروع نہیں کیا ہے جس کی ایک مسلم معاشرے میں اس سے توقع کی جاتی ہے۔

بعض لوگ اس شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کوئی بہت بڑا کردار ادا نہیں کرسکتی، کیونکہ جدید فلاحی ریاستیں اس سے کہیں زیادہ خرچ کر رہی ہیں جو زکوٰۃ سے مہیا ہوسکتا ہے۔ لیکن ریاست کے خرچ کا نجی شعبے کی زکوٰۃ کی رقوم سے تقابل غلط ہے۔ زکوٰۃ کی رقوم کا مقابلہ دوسرے ملکوں کے نجی شعبے کی صرف خیراتی رقوم ہی سے کیا جانا چاہیے۔ لیسٹر سلامون کے زیر قیادت جان ہوپ کن یونیورسٹی کی ایک مطالعاتی ٹیم کا نتیجہ تحقیق یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آخری نصف میں ترقی یافتہ ملکوں میں خیراتی مدات میں نجی طور پر دی گئی رقوم خام قومی پیداوار (جی ڈی پی) کے امریکا میں ایک فی صد سے لے کر اٹلی میں اعشاریہ ایک فی صد سے بھی کم کے لگ بھگ رہیں۔ ۱۹ اس کے مقابلے میں زکوٰۃ کی

لازمی شرح خالص دولت کا ڈھائی فی صد ہے۔اس سے کس قدر رقم فراہم ہوسکتی ہے، اس بارے میں خام قومی پیداوار کے ۱ء۸ سے ۳ء۴ فی صد کے درمیان مختلف اندازے لگائے گئے ہیں۔[۲۰] زکوٰۃ اس خرچ کے علاوہ ہوگی جس کی توقع خود اسلامی حکومت سے اپنے بجٹ کے ذرائع سے رکھی جاتی ہے۔اگر درست طریقے سے جمع اور خرچ کی جائے تو زکوٰۃ مشکلات کے ازالے، غربت کے خاتمے اور خود روزگاری کے مواقع کی توسیع میں اہم کردار کی ادائیگی کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔اس کی مدد سے مسلم ملکوں میں بے روزگاری اور آمدنی و دولت کی ناہمواریاں کم کی جاسکتی ہیں۔

عدل کا ایک ناگزیر حصہ ہر فرد کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہے۔خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ ''تمہاری جانیں، تمہارے جائیدادیں اور تمہاری عزتیں، تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں، اور حج کے دن کی طرح محترم ہیں۔[۲۱] تاہم زندگی کا تحفظ متعدد مسلمان ملکوں میں ایک بے تعبیر خواب بنا چلا آ رہا ہے۔عالمِ اسلام میں ایسے ملک ہیں جہاں ایک شخص کے لیے سرمایہ کاری مشکل ہے۔اگر وہ سرمایہ لگائے اور اس کا کاروبار فروغ پانے لگے تو عین ممکن ہے کہ کسی دن کوئی بڑا طاقتور شخص آ دھمکے اور کاروبار میں کوئی پیسہ لگائے بغیر منافع میں حصہ بٹانے کے لیے زبردستی سلیپنگ پارٹنر بن بیٹھے۔حتیٰ کہ وہ بہت کم قیمت ادا کر کے پورے کاروبار پر قبضہ بھی کرسکتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زندگی کا تحفظ بھی ایک مسئلہ بنا چلا آ رہا ہے۔رقم کی خاطر اغواء کیے جانے کے خطرات بھی موجود ہیں، جبکہ تاوان کی رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں آپ کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔دہشت گردی کے عام ہونے کی وجہ سے لوگ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔جب تک جان و مال اور جائیداد کا تحفظ نہ ہو لوگ اطمینان کے ساتھ سرمایہ کاری نہیں کر سکتے۔

تمام سماجی و معاشی اور سیاسی ذمہ داریوں کی دیانت داری سے تکمیل اسلام کی انتہائی اہم تعلیم ہے۔عدل کا تقاضا ہے کہ کام کرنے والوں کو ان کے کام کا جائز معاوضہ ادا کیا جائے۔ہمارے محنت کشوں کا معاوضہ اتنا بھی نہیں جو انہیں اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے قابل بنا سکے۔جب کاروبار کے مالکان سے پوچھا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ معاضے بڑھائیں تو

خاطر خواہ منافع کمانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ بہت بڑی مقدار میں دولت کماتے ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ دس سال پہلے کے مقابلے میں اب ان کے اثاثے کیا ہیں تو بھاری اضافہ نظر آئے گا۔ اس کے باوجود اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے محنت کشوں کو اتنا معاوضہ نہیں دے سکتے جس میں وہ اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرسکیں تو وہ بے انصافی اور غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔

ہر قسم کے ظلم سے ہر ایک کا تحفظ لازمی ہے۔ ابن تیمیہ اور بہت سے دوسرے علماء کے بقول ظلم و بے انصافی کسی بھی شخص یا کسی بھی چیز کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ ''کسی بھی چیز'' سے جانور، پرندے، حشرات الارض اور ماحول سب مراد ہیں اور ان کے ساتھ بھی ظلم کا روا رکھا جانا اسی طرح ممنوع ہے جیسے انسان کے ساتھ۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے تو ظلم و بے انصافی کسی کے ساتھ بھی جائز نہیں، بلالحاظ اس کے کہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم یا خود ظلم کا مرتکب ہے۔

عدل: اخلاقی اقدار، حکومت اور آخرت کا کردار

عدل و انصاف، طرزِ عمل کے ایک ضابطے کو لازم کرتا ہے۔ تقریباً تمام مذاہب کی جانب سے یہ ضابطہ کسی نہ کسی شکل میں فراہم کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں سے دیانت داری، اپنی تمام ذمہ داریوں اور وعدوں کی تکمیل اور دھوکے اور فریب سے باز رہنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ عدل کا قیام طرز عمل کے ان اصولوں کی سختی سے پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔

بہرصورت یہ اس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتے جب تک لوگ ان سے پوری طرح واقف نہ ہوں، اور پھر ان پر دیانت داری سے عمل نہ کریں۔ اس لیے ان اصولوں کی تعلیم ہر شخص کو دینا ضروری ہے۔ مگر ایسا نہیں کیا جارہا ہے۔ حتٰی کہ اسکولوں اور کالجوں کا تو ذکر ہی کیا، مسجدیں بھی یہ تعلیم نہیں دے رہی ہیں۔ ضروری ہے کہ ائمہ مساجد اپنے خطبوں میں اسلام کے تقاضوں کے مطابق دیانت داری، اخلاص، وقت کی پابندی، ان تھک محنت، تمام وعدوں، معاہدوں اور سماجی ذمہ داریوں کی تکمیل جیسی قدروں کی پاسداری پر زور دیں۔ کم ہی کسی شخص کو کسی خطبے میں یہ سننے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ اگر آپ دفتر دیر سے جاتے ہیں، کام مستعدی سے نہیں کرتے اور پھر بھی تنخواہ پوری وصول کرتے ہیں تو آپ فریب

دہی کے مرتکب ہورہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے ''یاددِہانی کراؤ، اگر یاددِہانی کرانا مفید ہو'' (الاعلیٰ ۸۷:۹)۔ اس لیے لوگوں کو تعلیم دی جانی چاہیے اوران قدروں کی یاددِہانی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

بہرکیف، اگرلوگ ان قدروں کا علم رکھتے ہوں تب بھی ضروری نہیں کہ وہ ان کی پابندی بھی کریں۔قرآن اور سنت اقدار دے سکتے ہیں مگر وہ خود انہیں نافذ نہیں کرسکتے۔ اور اگر نفاذ نہ ہو تو ان قدروں کی کوئی عملی افادیت نہیں رہ جاتی۔ انہیں نافذ کرنا کس کا کام ہے؟ اس مرحلے پر حکومت کو بنیادی کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حکومت سے وہ کام لیتا ہے جو قرآن سے نہیں لیتا۔''[۲۲]

ان قدروں کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ وہ یہ کام ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں کو استعمال کرکے انجام دے سکتی ہے۔ اگرلوگوں کو ان کی محنت وکوشش اور پیداواری عمل میں شرکت کا جائز صلہ نہ ملے تو ان کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ اسی طرح اگر دھوکے اور بددیانتی کا ارتکاب کرنے والوں کو کبھی سزا نہ دی جائے تو مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورے نظام میں سرایت کرجاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بعض اوقات میں نے اپنے کاروباری لوگوں سے پوچھا کہ وہ دھوکا دہی اور جعل سازی کیوں کرتے ہیں؟ تو ان کا جواب تھا: ''ہم کیا کرسکتے ہیں؟ جب دوسرے تمام لوگ فریب دہی اور جعل سازی سے کام لے رہے ہوں اور ہم ایسا نہ کریں تو ہمیں زیادہ قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اس صورت میں ہم مسابقت کے قابل نہیں رہیں گے اور اپنے گاہکوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' اس سے واضح ہے کہ بددیانتی عام ہو تو ایماندار اور محنتی لوگوں کے لیے بھی بھیڑ چال سے بچنا دشوار ہوجاتا ہے۔

اب سوال اُٹھتا ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داریاں دیانت داری سے کب پوری کرے گی؟ جواب یہ ہے کہ جب وہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ اگر کوئی جوابدہی نہیں ہوگی تو حکومتی اہلکاروں پر اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے کوئی دباؤ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ لوگوں کے سامنے جوابدہ ہیں اور لوگ انہیں ان کے عہدوں سے ہٹا سکتے ہیں تو ان پر دباؤ ہوتا ہے کہ وہ مسائل کے حل کے لیے حتی الامکان

بہتر سے بہتر طور پر کام کریں۔ یہ جمہوریت ہے جو اس جوابدہی کو یقینی بناتی ہے۔ اس لیے حکومتوں کی جانب سے ذمہ داریوں کی مؤثر ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے جمہوریت ضروری ہے۔

جمہوریت اسلامی تعلیمات کے بنیادی عناصر میں سے ایک ہے۔ چاروں خلفائے راشدینؓ میں سے کوئی بھی طاقت یا وراثت کی بنیاد پر اقتدار میں نہیں آیا۔ وہ سب عوام کے منتخب کردہ تھے۔ اس دور میں ایسے انتخابات ممکن نہیں تھے جیسے آج ہم دیکھتے ہیں۔ جو کچھ ممکن تھا وہ یہ تھا کہ لوگوں کی ایک تعداد کسی متعین مقامِ اجتماع پر جمع ہو جائے اور اپنے میں سے کسی کو خلیفہ بننے کے لیے منتخب کر لے۔ اس کے بعد دوسرے تمام لوگ بیعت کے ذریعے، جو ایک سماجی معاہدہ ہے، رضا کارانہ طور پر اس سے وفاداری کا اظہار کریں۔ جبکہ حکمراں وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی تحویل میں آنے والے تمام انسانی اور مادّی وسائل کے دیانت دارانہ استعمال کے ذریعے لوگوں کی خیر وفلاح کو یقینی بنا کر اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریاں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق ادا کرے گا۔ اس کے بدلے میں لوگ اسے اپنے تعاون اور اطاعت کی یقین دہانی کراتے ہیں۔ یہ طریقہ تھا جو اس دور میں استعمال کیا گیا۔ موجودہ زمانے میں بہترین طریقہ بہر صورت الیکشن ہی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج الیکشن جس طرح ہوتے ہیں اسے مکمل طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور کے الیکشنوں میں دولت اور طاقت کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے اور اسے جہاں تک ممکن ہو گھٹایا جانا چاہیے۔ جمہوریت پر آج کس طرح عمل ہو رہا ہے، اس میں اصلاح انتہائی ضروری ہے۔ تاہم اپنی تمام خامیوں کے باوجود بھی جمہوریت بہترین طرزِ حکومت ہے اور اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔

بہرکیف، اگر ہم حکومت کی جابرانہ طاقت پر بہت زیادہ انحصار کریں گے تو اس کی وجہ سے سرکاری اخراجات بہت بڑھ جائیں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حکومت کے کردار کے ساتھ کسی دوسرے میکانزم سے بھی کام لیا جائے تاکہ اس کا بوجھ کم کیا جا سکے۔ اسلام اور دوسرے بڑے مذاہب اپنے بنیادی عقائد کے مجموعے کے اندر ہی اچھائی کی طرف راغب کرنے اور برائی سے روکنے کا ایک بندوبست رکھتے ہیں۔ یہ یومِ حساب کا تصور ہے، جس کا مطلب ہے کہ اگر انسان اپنی ذمہ داریاں دیانت داری سے ادا

کرے گا تو وہ آخرت میں بھی اچھا بدلہ پائے گا اور اگر وہ دھوکے اور فریب کا مرتکب ہوگا، مثلاً رشوت لے گا، تو ممکن ہے کہ اس دنیا میں تو سزا سے بچ جائے لیکن آخرت میں نہیں بچ سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اس کے ہر عمل سے واقف ہے۔ اس بات پر ایمان انسان کو آپ اپنا محتسب بنا دیتا ہے، جس کی بناء پر وہ کسی دوسرے دباؤ کے بغیر بھی اپنی ذمہ داریاں درست طور پر ادا کرتا ہے۔

جمہوریت اور عدل مسلم دنیا میں

آیئے اب ہم آج کی مسلم دنیا پر ایک نظر ڈالیں۔ او آئی سی کے رکن ۵۷ ملکوں میں سے صرف ۱۳ یعنی ۲۳ فی صد میں جمہوریت ہے، جبکہ ۴۴ میں نہیں ہے۔ ان ۴۴ میں سے ۳۱ میں نقلی جمہوریت ہے، ۵ ملکوں میں مکمل بادشاہت، ۳ میں آمریت اور ۵ عبوری دور میں ہیں۔[۲۳] اور جن ملکوں میں جمہوریت ہے، ان میں بھی یہ محض رسمی مفہوم میں ہے۔ ان میں انتخابات ہوتے ہیں اور جمہوری ڈھانچے اقتدار کی تبدیلی کا ایک طریقہ کار مہیا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مخصوص مفادات رکھنے والے طاقتور گروہ ہی بار بار منتخب ہوتے ہیں۔ غریب اور غیر مراعات یافتہ طبقے بیشتر صورتوں میں اپنی خواہش کے مطابق ووٹ دینے کے لیے آزاد نہیں ہوتے اور مقتدر طبقوں میں ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

جمہوریت کے اس فقدان کی وجہ سے مسلم ملکوں میں پریس کی آزادی پر قدغنیں ہیں۔ اس حوالے سے صرف چار مسلمان ملک آزاد ہیں۔ وہ ملک جہاں اخبارات آزاد ہیں مگر ٹیلی وژن حکومت کے کنٹرول میں ہونے کی وجہ سے آزاد نہیں، وہ جزوی طور پر آزاد قرار دیے جاتے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے ۱۴ ملک جزوی طور پر آزاد ہیں، جبکہ ۳۹ ذرائع ابلاغ کی آزادی سے مکمل طور پر محروم ہیں۔[۲۴] پریس کی آزادی نہ ہونے کا نتیجہ بری حکمرانی، شفافیت کے فقدان، غیر صحت مند پالیسیوں اور بدعنوانی کی شکل میں نکلتا ہے۔[۲۵]

بدعنوانی کی کیفیت کی پیمائش ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی وضع کردہ کرپشن پرسپشن انڈیکس

(۲۰۰۷ء) سے کی جا سکتی ہے، جس میں اس حوالے سے ۱۸۰ ملکوں کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ اشاریہ ۱۰ (سب سے کم بدعنوان) سے لے کر صفر (سب سے زیادہ بدعنوان) کی حدوں کے درمیان ہے۔ ۵ نمبر سرحدی (بارڈر لائن) ملک کی نشان دہی کرتے ہیں۔ صرف چار مسلمان ملک اس سرحدی نشان سے اوپر ہیں، اور وہ بھی کسی بلند اسکور کے حامل نہیں ہے۔ ان میں سے بلند ترین ۶ء۰ اور پست ترین ۵ء۰ ہے، یعنی عین سرحد پر۔ ۴۹ مسلمان ملک بارڈر لائن سے نیچے ہیں اور باقی ملکوں کے حوالے سے کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ جن ملکوں کے اعداد و شمار دستیاب نہیں، بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ بھی بارڈر لائن سے نیچے ہوں۔ یہ صورت اس حقیقت کے باوجود ہے کہ قرآن رشوت اور دوسرے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔ (البقرہ ۲:۱۸۸، اور النساء ۴:۲۹)۔

جمہوریت کے فقدان کا سماجی و معاشی انصاف پر ایک اور اثر بھی ہوتا ہے۔ کرپشن، آزادیٔ اظہار کے فقدان کے ساتھ مل کر عدالتوں کو بھی بدعنوانی کی راہ پر ڈالنے کا سبب بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ حکمراں عناصر عموماً اپنے جرائم کی سزا نہیں پاتے۔ یہ چیز برائی کے خاتمے کو مشکل بنا دیتی ہے۔ اگر صرف غریبوں کو سزا ملے تو اس کی وجہ سے بے اطمینانی بڑھتی ہے اور سماجی اتحاد و یکجہتی میں انحطاط واقع ہوتا ہے۔ کمزور حکمرانی (جو جوابدہی کے نہ ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے) اور کرپشن، اور بے انصافی اور ترقی کی رفتار کے سست ہونے میں قریبی تعلق ہے۔ کمزور حکمرانی، کرپشن اور ترقی کی سست رفتاری ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

سماجی و معاشی انصاف اس کیفیت سے کس طرح متاثر ہوتا ہے؟ کرپشن کی وجہ سے منصفانہ ترقی کے لیے مختص قومی وسائل کا ناجائز استعمال فروغ پاتا ہے۔ وسائل کا ایک بڑا حصہ کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس طرح امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ کئی مسلمان ملک ایسے ہیں جن میں ترقیاتی منصوبوں کی لاگت کا پچاس فی صد تک بیکس کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس سے معاشی ترقی کی رفتار گھٹتی ہے، ضروریات کی تکمیل اور روزگار کو نقصان پہنچتا ہے اور آمدنی اور دولت کی ناہمواری

بڑھتی ہے۔ کرپشن کے یہ بالکل فطری نتائج ہیں۔ حکومت کی جانب سے اپنے وسائل کا غیر مؤثر استعمال، نجی شعبے کی سرمایہ کاری اور روزگار کے مواقع کو گھٹانے کا سبب بنتا ہے۔ اوران سب کے نتیجے میں آمدنی اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی صورتِ حال مزید سنگین ہوتی چلی جاتی ہے۔

قانون کے مطابق انصاف کی فراہمی کا عمل بھی متاثر ہوتا ہے، کیونکہ عدالتیں بھی کرپٹ ہوجاتی ہیں۔ حکومتیں بددیانت ہوں تو عدالتیں بھی اسی رُخ پر چل پڑتی ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔

آگے بڑھنے کا راستہ

اس کے باوجود مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ مسلم دنیا میں تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں۔ ان کی رفتار کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ آغاز کہاں سے کیا جائے؟ کیا ہمیں ناجائز حکومتوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرنی چاہیے جو مسئلے کا سبب ہیں؟ جواب ہے: نہیں، ہرگز نہیں۔ ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے ابوجہل اور ابوسفیان اور اپنے معاشرے کے دوسرے زعماء کو قیادت کے منصب سے ہٹادینے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اس بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ اگر ایک بار انہوں نے یہ موضوع چھیڑ دیا تو وہ اسلام کو دبانے کے لیے اپنی کوششیں دوگنی کردیں گے۔ اس لیے ان کا طریقہ سماجی ومعاشی اصلاح کو عمل میں لانے پر مبنی تھا۔ انہوں نے لوگوں کی سماجی ومعاشی حالت کو بہتر بنانے اوران کی زندگیوں میں بہتری لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے تعلیم، اخلاقی اور سماجی ومعاشی اصلاح اور غریبوں کی ضروریات کی تکمیل اور نہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے قابل بنانے کے لیے مالی سہولتوں کی فراہمی کے ذریعے اس پر توجہ مرتکز کی۔ اس مقصد کے لیے زکوٰۃ کا بہت بڑی حد تک استعمال کیا گیا۔

یہ ہے وہ کام جو ہمیں کرنا چاہیے: تعلیم اور اخلاقی اور سماجی ومعاشی بہتری پر توجہ، اور خود روزگار

کمانے کے قابل بنانے کے لیے غریبوں کو مالی سہولتوں کی فراہمی۔ایک بار غریبوں کی سماجی ومعاشی حالت بہتر ہوجائے تو اقتدار کے ڈھانچے خود ہی زمیں بوس ہوجائیں گے۔ دورِ اوّل کے مسلم معاشرے میں یہی کچھ ہوا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سماجی ومعاشی بہتری عمل میں لائے۔ اقتدار کے جابرانہ ڈھانچوں کے منہدم ہونے کے بعد لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی راہیں مزید کشادہ ہوگئیں۔اوّلین معاشرے میں عمومی خوشحالی پھیلی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے کئی ادوار میں دولت مند لوگ زکوٰۃ کی تقسیم کے لیے نکلتے مگر اُسے قبول کرنے والا کوئی نہ ملتا تھا، کیونکہ غریبوں کی حالت نمایاں طور پر بہتر ہوچکی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاسی اصلاح کو ملتوی کر دیا جانا چاہیے۔اس کے لیے کوشش کی جانی چاہیے، مگر پُرامن ذرائع سے۔تشدد کا استعمال جائز نہیں ہے، کیونکہ جدید حکومتیں بغاوت کو دبانے اور اس میں حصہ لینے والوں کو اذیتیں دینے اور کچل ڈالنے کے غیر معمولی ذرائع رکھتی ہیں۔ برسرِ اقتدار طاقتوں کو تشدد کے بل پر اکھاڑ پھینکنے کی کوئی بھی کوشش بھاری جانی ومالی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے بھی غیر مستحکم ہوسکتے ہیں، ترقی اور اصلاح کے عمل کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور پہلے سے موجود مسائل مزید گھمبیر ہوسکتے ہیں۔

اس بناء پر سیاسی اصلاح کا بہترین طریقہ اس مقصد کے لیے پُرامن جدوجہد ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ پُرامن جدوجہد کامیاب نہیں ہوسکتی۔پُرامن جدوجہد کامیاب ہورہی ہے اور استبدادی حکومتیں ہر جگہ منہدم ہورہی ہیں۔۱۹۷۴ء میں پوری دنیا میں صرف ۳۹ یعنی چار میں سے ایک ملک جمہوری تھا۔آج ۱۱۵ ممالک یعنی ہر دو میں سے ایک اپنی سیاسی قیادت کے چناؤ کے لیے کھلے الیکشن کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔لہٰذا پُرامن جدوجہد حکومت میں تبدیلی لانے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔

کیا مغربی دنیا مدد کرسکتی ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کی گلوبلائزڈ دنیا میں کیا مغربی طاقتیں اس حوالے سے مدد کرسکتی

ہیں؟ وہ ایسا کرسکتی ہیں، اگر وہ چاہیں۔ وہ آمروں کی سرپرستی نہ کر کے اوران پر جمہوریت کے قیام کے لیے دباؤ ڈال کر تعاون کرسکتی ہیں۔ وہ دھاندلی کی روک تھام کو یقینی بنانے کی خاطر انتخابی عمل کی نگرانی کر کے بھی مدد کرسکتی ہیں۔ وہ سماجی و معاشی بہتری کو فروغ دے کر بھی معاون بن سکتی ہیں۔ اگر سماجی و معاشی بہتری کو یقینی بنا دیا جائے تو اقتدار کا ڈھانچہ کسی نہ کسی وقت زمیں بوس ہو کر رہے گا۔

تاہم مغربی دنیا جمہوریت کے فروغ میں اس طریقے سے ہرگز مددگار ثابت نہیں ہوسکتی جو امریکہ نے عراق میں اختیار کیا، یعنی ایک ملک پر فوج کشی، اس کے بنیادی ڈھانچے اور معیشت کی بربادی، لوگوں کا قتلِ عام اور انہیں مفلس و قلاش بنا دینا، اور ان کے گزر بسر کے ذرائع کو تباہ کر دینا۔ کسی ملک میں جمہوریت لانے کا یہ بدترین طریقہ ہے۔ اب ہر شخص جانتا ہے کہ یہ پرتشدد اور غیر جمہوری طریقہ جمہوریت کے قیام کے لیے نہیں اپنایا گیا تھا۔ یہ سب اسرائیل کو تحفظ مہیا کرنے اور عراق کے تیل کے ذخائر اور نتیجتاً خلیج کے پورے علاقے پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے تھا۔ امریکہ کی طرف سے کیے گئے اس ظالمانہ اور وحشیانہ حملے نے نہ صرف عراق کو غیر مستحکم اور تباہ کیا بلکہ امریکہ اور پوری مسلم دنیا کے درمیان نفرت کی خلیج بھی پیدا کر دی۔ اس لیے بہترین طریقہ جس سے مغرب جمہوریت کے فروغ میں تعاون کرسکتا ہے وہ کسی ملک کے خلاف فوج کشی نہیں بلکہ سماجی و معاشی بہتری کی کوشش، جمہوریت کو یقینی بنانا اور مطلق العنان حکومتوں پر تبدیلی کے لیے دباؤ ڈالنا ہے۔

جب ہم جمہوریت کو یقینی بنانے میں تعاون کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب محض انتخابات کی نگرانی نہیں ہوتا، بلکہ ہماری مراد آزاد پریس، خودمختار اور دیانت دار عدلیہ، سماجی و معاشی عدل، صحت مند مالی، مالیاتی اور زری پالیسیوں، مناسب قوانین اور ان کے مؤثر نفاذ سمیت متعدد اداروں کے ساتھ تعاون سے ہوتی ہے۔ جمہوریت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ سب ضروری ہیں۔ اس لیے ان چیزوں کو مسلم ملکوں میں فروغ دینا خود مغرب کے طویل المیعاد مفاد میں ہے۔

کیا اسلام اہم کردار ادا کرسکتا ہے؟

اب ہم اس سوال پر آتے ہیں کہ کیا اسلام ایک مفید اور عمل انگیز کردار ادا کرسکتا ہے؟ جواب ہے: یقیناً۔ اسلام جمہوریت اور عام لوگوں کی خیر و فلاح کا علم بردار ہے۔ اور یہ افراد کے اندر دیانت داری، اخلاص، وقت کی پابندی، ذمہ داریوں میں انہماک، اَن تھک محنت، وسائل کا احتیاط سے استعمال، اور تمام سماجی و معاشی ذمہ داریوں اور وعدوں کی ایمان داری سے تکمیل جیسی مطلوبہ اخلاقی صفات پیدا کرسکتا ہے۔ یہ تمام صفات ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اسلام ان اقدار کو عمل کی شکل دیتا اور لوگوں کے اندر انہیں پروان چڑھانے کا حیرت انگیز ملکہ بھی رکھتا ہے۔ یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اخلاقی ترقی کے بغیر کوئی معاشی ترقی ممکن نہیں۔ جب تک لوگ اپنے معاہدے پورے نہ کریں، جب تک وہ پوری دیانت داری سے اَن تھک محنت نہ کریں، اور جب تک دھوکے، فریب اور کرپشن کو کم نہ کیا جائے، اُس وقت تک کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اس میں جو چیز معاون ہوسکتی ہے وہ ہے اخلاقی ترقی اور اداراتی اصلاحات، جس کی بناء پر لوگ اپنی محنت کا جائز صلہ پانے کے لائق ہوسکیں۔ اسلام مصرفانہ اخراجات کے رجحان کو روکنے اور بچت و سرمایہ کاری کو بڑھانے میں بھی مدد کرسکتا ہے۔ ایک اور بڑا کام جو اسلام کرسکتا ہے وہ خاندان کے ادارے کا استحکام اور سماجی اتحاد و یکجہتی کی مضبوطی ہے۔ تاہم ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صرف زبانی جمع خرچ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔

سیکولرازم کی کارکردگی اس کے بالکل برعکس ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ مصرفانہ اخراجات کے رجحان کو فروغ دے گا اور اس طرح بددیانتی اور کرپشن کو بڑھانے کا سبب بنے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان امراض کے بنیادی اسباب میں سے ایک، دستیاب وسائل سے بڑھ کر زندگی بسر کرنا ہے۔ جب لوگ بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں تو اس کے لیے انہیں کسی نہ کسی طرح مالی وسائل حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ اس کا عام طریقہ بددیانتی اور بدعنوانی ہے۔ اس لیے مصرفانہ اخراجات جس قدر بڑھیں گے، اسی تناسب سے ان خرابیوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ سیکولرازم خاندان کی یکجہتی پر بھی آزادانہ صنفی اختلاط کے ذریعے منفی طور پر اثر انداز ہوگا، جیسا کہ بیشتر سیکولر معاشروں میں ہوچکا ہے۔

بہرصورت مسلم دنیا میں صدیوں کے انحطاط کے سبب لگ جانے والے زنگ کو دور کرنے کے لیے خود اسلام کے فہم وشعور کے حوالے سے اصلاح کی ضرورت موجود ہے۔ بہت سے چیزیں ایسی ہیں جو درحقیقت غیر اسلامی ہیں مگر اسلامی منظر نامے کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ ڈاکٹر مراد ہوفمین، جو ایک مخلص جرمن مسلمان ہیں، بالکل درست طور پر کہتے ہیں: ''میری نگاہ میں اس سے بہتر کوئی بات تجویز نہیں کی جاسکتی کہ مسلم دنیا حقیقی معنوں میں 'بنیاد پرست' بن جائے۔ یعنی اسلامی عقیدے کی اصل بنیادوں کی طرف لوٹ جائے، اوران عوامل کا تجزیہ کرے جو مدینہ، اندلس اور عباسی دور میں عروج کا سبب بنے تھے۔''۲۶ اس اصلاح میں ہمیں انسانوں اوران کے رویے اور فلاح و بہبود پر اثر انداز ہونے والے اداروں پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ توجہ دینی ہوگی تاکہ مقاصدِ شریعت عملی جامہ پہن سکیں۔

شریعت بھائی چارے، انصاف، دیانت، اخلاص، وقت کی پابندی، فرائض کی ادائیگی میں انہماک، تمام سماجی ومعاشی ذمہ داریوں اور وعدوں کی تکمیل، اور متعدد اچھی صفات کو پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ اس کے بالکل برعکس، ہمارے ہاں حقیقی خوبیوں کے مقابلے میں ظاہری اور نمائشی باتوں پر زیادہ زور ہے۔ ظاہری پیش کش بھی اہمیت رکھتی ہے مگر باطنی خوبیاں اس سے زیادہ اہم ہیں۔

یہ بات ہمیں مسلم دنیا میں سماجی ومعاشی عدل اور گلوبلائزیشن کے باہمی تعلق کے حتمی سوال تک لاتی ہے۔ سماجی ومعاشی انصاف مسلم دنیا میں ترقیاتی عمل کو تیز کرنے اور موجودہ بے چینی کو کم کرنے میں معاون ہوگا۔ یہ چیز باہمی تجارت اور مسلم دنیا اور باقی دنیا کے ایک دوسرے پر انحصار کو بڑھانے کا سبب بنے گی۔ باہمی انحصار جتنا بڑھے گا، تنازعات کو تحریک دینے کی وجوہات اتنی ہی گھٹتی چلی جائیں گی۔ اس طرح پوری دنیا میں بہتری آئے گی۔

ان تمام مباحث سے، میں کہنا چاہوں گا کہ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مسلم دنیا کا مستقبل روشن ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدیاں مسلمانوں کے لیے یقیناً بری تھیں جب وہ اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ مغربی ملکوں نے انھیں غلام بنالیا تھا۔ تاہم اب تقریباً سارے مسلمان ملک آزادی حاصل کر چکے ہیں

اوران کے اندر احیائے اسلام کا عمل بھی جاری ہے۔ یہ چیز مسلمانوں کے معیار کی بہتری کا سبب بنے گی۔ تعلیم عام ہو رہی ہے، ناخواندگی کی شرح گھٹ رہی ہے، اور معاشی ترقی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومتیں بھی بتدریج عوام کے سامنے زیادہ جوابدہ ہوتی جا رہی ہیں۔

ان تمام چیزوں کو اسلام کے اصل مقصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کا معاون بننا چاہیے جو کہ امن، اخلاقی بہتری، بھائی چارے، عدل وانصاف، اور حقیقی معنوں میں آفاقی خیر وفلاح کو فروغ دے کر پوری انسانیت کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے۔ میں سرنگ کے دوسرے کنارے پر چمکدار روشنی دیکھ رہا ہوں۔

............حواشی............

۱: صحیح مسلم، نمبر ۵۶، کتاب البر والصلہ والا دب، باب تحریم الظلم، از جابر ابن عبد اللہ (جلد ۴، ص ۱۹۶۶)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ ظلمات استعمال کیا ہے، جو ظلمت کی جمع ہے جس کا مطلب ایسی تہ بر تہ تاریکی ہے جو مکمل اندھیرے تک پہنچاتی ہے۔ یہی بات قرآن میں بھی کہی گئی ہے: سورۂ نور ۲۴: ۴۰

۲: ابن تیمیہؒ، مجموع، جلد ۵، ص ۱۲۷۔

۳: ابن خلدون، مقدمہ، ۲۸۷۔

۴: ورلڈ بینک کی رپورٹ ''ورلڈ ڈیولپمنٹ انڈی کیٹرز ۲۰۰۴'' صفحہ ۲۵۳ میں دی گئی معلومات پر مبنی۔

۵: ایضاً

۶: سلیم "Why are Muslims so powerless?"

۷: خواندگی، تعلیم، صاف پانی، صحت وصفائی کی سہولتوں کے بارے میں یہ تمام معلومات اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کی رپورٹ Key Socio-Economic Statistics on IDB member Countries سے لی گئی ہیں۔ صفحات ۱۳-۱۵۔

۸: یہ معلومات اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام(UNDP) کی ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ برائے ۲۰۰۷/ ۲۰۰۸ سے لی گئی ہیں، صفحات ۲۲۹-۴۳۲۔

۹: ابن خلدون ماڈل کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے *فیوچر آف اکنامکس* از چھاپرا، ۱۴۵-۱۷۲، مزید دیکھئے: ''اکنامک تھاٹ ان اسلام: ابن خلدون'' از اسپنگلر ۲۶۸-۳۰۶، ''ابن خلدون'' از بولا کیا ۱۱۰۵-۱۱۱۸، نیز دیکھئے: ''مسلم اسکالرز اینڈ دی ہسٹری آف اکنامکس'' از میراخور ۲۴۵-۲۷۶۔

۱۰: ابن خلدون کی جانب سے پورے مقدمے میں استعمال کیے گئے الفاظ ہیں *مؤذن اور مفدی*، جس کا مطلب ہے کسی چیز کی طرف ''مدعو کرنا'' یا ''قیادت کرنا''۔ تاہم ''ٹریگر میکا نزم'' کی اصطلاح یہاں اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ انگریزی میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے اس کا استعمال عام ہے۔

۱۱: ٹوائن بی، ''اسٹڈی آف ہسٹری''، جلد ۲، ص ۳۰۔ بائیک (Baeck) پرزور انداز میں کہتا ہے: ''یہ اسلام ہی تھا جس کی وجہ سے وہ (عرب) عالمی طاقت اور بحیرہ روم کے علاقے کے بڑے حصے کے لیے رہنما روشنی بن گئے۔ قدیم دور سے بارھویں صدی میں لاطینی یورپ کے ظہور تک کے عبوری زمانے کے دوران، اسلام اپنے دور عروج میں تھا اور اس نے میڈی ٹرے نین تہذیب اور تاریخ کے معمار کی حیثیت سے زبردست کردار ادا کیا۔'' (میڈی ٹرے نین ٹریڈیشن ان اکنامک تھاٹ، ص ۹۹۵)

۱۲: نارتھ اینڈ تھامس، ''دی رائز آف دی ویسٹرن ورلڈ''، ۲-۳، اور نارتھ، ''انسٹی ٹیوشنز، انسٹی ٹیوشنل چینج اینڈ اکنامک پرفارمنس''، ۳-۱۰۔

۱۳: شیٹز ملر، ''لیبران دی میڈیول اسلامک ورلڈ''، ص ۴۰۵۔

۱۴: کوہن، ''اکنامی، سوسائٹی، انسٹی ٹیوشنز'' ص ۴۵۲، صفحات ۵۱۱ تا ۵۳۸ بھی دیکھیے۔

۱۵: روڈ ڈ، ''ویمن ان اسلامک بایوگرافیکل کلکشنز''، ص ۲۹۔

۱۶: ایضاً، vii

۱۷: سارٹن، ''انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس''، جلد۔۱، اور جلد۔۲، بی کے ۱۔

۱۸: حق، ''اسٹرے ٹیجی آف اکنامک پلاننگ''، ص ۳۰۔